R. N. 2186/57

Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ھند کا ھفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ ...
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت

جلد ۲۰ - شمارہ ۴۶	ایڈیٹر - آل احمد سرور	علی گڑھ - ۱۵ دسمبر ۱۹۶۱ء

پروفیسر عبدالقادر سروری

سرسید کے نام ایک خط

سرسید احمد خاں نے ۱۲۸۳ھ یا اس کے لگ بھگ علی گڑھ میں لاوارث بچوں کی پرورش کے لئے ایک یتیم خانہ قائم کرنے کی تجویز بنائی تھی جس کا حال ہم کو ذیل کے خط سے ہوتا ہے۔ سرسید کے اعلان کی سرخی یہ تھی "ایک تدبیر یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش کی"۔ اس اعلان پر حیدرآباد کے ایک اہل قلم ظہیر الدین ظہیر نے یہ خط اپنے والد کی جانب سے سرسید کے نام لکھا تھا جس میں یتیم خانہ قائم کرنے کی تجویز کو سراہا گیا ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ یتیم خانہ کی ایک شاخ مدراس میں بھی قائم کی جائے۔ ان کا وطن تھا۔

ظہیر الدین ظہیر کا اصلی وطن مدراس تھا لیکن وہ حیدرآباد آکر رہ گئے تھے۔ یہ اچھے انشا پرداز تھے اور اردو نظم و نثر کے علاوہ فارسی شعر بھی کہتے تھے۔ ظہیر کے حالات عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ اتفاق سے ان کے مسودوں کی ایک بیاض مجلس تحقیقات اردو، حیدرآباد کے کتب خانہ میں محفوظ رہ گئی ہے، جو غالباً خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی، کہیں کہیں اصلاح بھی کی گئی ہے۔ اس بیاض میں ان کے خطوط، مزاحیہ مضامین، چٹکلے اور اردو و فارسی نظمیں شامل ہیں۔

ظہیر "اودھ پنچ" کے دبستان کے انشا پردازوں سے تعلق رکھتے تھے اور چھوٹے چھوٹے مزاحیہ مضامین، خطوط اور لطیفے لکھ کر اخبار کو بھیجا کرتے تھے۔ ان تحریروں کے مسودوں کو وہ بیاض میں جو × تقطیع کے ( ) اوراق پر مشتمل ہے محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ انھیں میں یہ خط بھی شامل ہے۔

"اودھ پنچ" اپنے زمانے کے بہت سے نوجوان انشا پردازوں کے لئے محرک بنا ہوا تھا۔ اکثر نوجوان اس کے لکھنے والوں کا اتباع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھیں میں ظہیر بھی شامل تھے ان کے مزاح اور ظرافت کا عام انداز بھی وہی ہے جو "اودھ پنچ" کی خصوصیت تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ظہیر کو "اودھ پنچ" کے دوسرے انشا پردازوں کی سی شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ صف اول کے لکھنے والوں میں نہیں تھے۔ اب اس کا پتہ چلانا بھی آسان نہیں ہے کہ ان کی ساری تحریریں جو "اودھ پنچ" کو بھیجی جاتی تھیں، چھپ جاتی تھیں۔ ان کے بعض خطوط کے مسودوں سے اتنا تو اندازہ ہوتا ہے کہ "اودھ پنچ" کے ایڈیٹر اور مہتمم سے ان کے اچھے مراسم تھے۔

یہ جو بیاض میں " کی" سرخی کے تحت درج ہے، سنجیدہ لب و لہجہ میں لکھا گیا ہے تاہم اس کا ایقان ہے یہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ ظہیر کے مزاج میں کچھ دلچسپ عناصر مل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک خط کا اقتباس ہے:-

> "حضرت جناب، عالم، فاضل، شاعر، حافظ، عاشق، حکیم، قاضی، مفتی، مورخ، منطقی، فلسفی، ریاضی داں، محاسب، نجومی، رمال، کوتوال، وکیل، بنگلیت، چٹکیت، بیت، جوتشیا، کشتی گیر، پیراک، چابک سوار، طبارچی، گل باعصر ماو، ہمہ داں، ہفت زبان، جرنیل، نواب، مولانا، مرشد، ... مولوی، حاجی، شیخ، سید، مغل، پٹھان، اودھ پنچی خاں صاحب بہادر، شہید، اے ایل ایس شوش، ایل ایل ڈی، کمشنر، کلکٹر، کمشنر، وزیر، امیر، مدظلہ العالی متعالی سلامت۔

ظہیر کی شاعری کے بھی ایک دو نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

خالی رہے ہے جہان کے ہم کام کاج سے
دم آگیا ہے ناک میں اس احتیاج سے
دل بس میں ہو تو کھالیں قسم ہم تو آج سے
پالا پڑا ہے ہم کو عجب بدمزاج سے

سو مرتبہ رقیب کے گھر آپ جاسکے
پر تک نہ میرے واسطے تشریف لاسکے
کیا ذکر غیر اُس کی جو پرچھائیں پاسکے
پردے سے آنکھ کے کبھی باہر تو جاسکے
کیا منہ کسی کا منہ تری شمشیر کے چڑھے
پہلے زبان تو کوئی اس ڈھب کی پاسکے
اتنا بھی اب نظر نہیں آتا کوئی ظہیر
اچھا برا زمانے پہ جو آزما سکے

ظہیر کے خط کا عنوان ہے: "از طرف والد ماجد سید احمد خان، سی، ایس، آئی، تحریر یافتہ" خط درج ذیل ہے:۔

حامداً و مصلیاً و مسلماً

آپ کا اشتہار جس کا سرنامہ یہ ہے: "ایک تدبیر یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش کی" میری نظر سے گذرا۔ کیا پوچھنا آپ کی تدبیر ہے سراسر بہبود خاص و عام و رفاہ امیر و فقیر ہے آپ کی ذات کو مجمع احسانات کہئے تو زیبا ہے۔ محض خیرات اور عین مبرات لکھئے تو سزا ہے۔ ہمدردی قوم میں آپ کا ثانی معدوم ہے۔ حسن تدبیر و مآل اندیشی میں کوئی آپ کا نظیر ہونا معلوم ہے۔ غرض ہمارا دل تو آپ کی اس مصلحت سے نہایت درجہ مسرت اندوز ہے۔ میں تو میں ہر ایک فرزند و متعلق میرا دست بہ دعا شب و روز ہے۔ الٰہی اس کار خیر کو بہ حسن سرانجام انجام کر اور اس کا نفع ہر یک قوم بلکہ ہر یک آدمی کو ہندوستان کے شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب تک عام کر۔ اس کو تمام کرنے سے پیشتر اپنی ایک خواہش کو ظاہر کرنا برا نہ ہوگا۔ اور اس طبیب دلہا کے روبرو سارا احوال بیان کردینا بے جا نہ ہوگا۔ یعنی ہمارے اس پاس میں، خاص کر مدراس میں جو میرا وطن اصلی ہے، پادریوں کا وہ زور شور اور ہر روز وہ ترقی ہے کہ معاذ اللہ۔ یہ یتیم خانہ اور اس کی کمیٹی فقط علی گڑھ ہی میں رہے تو اُسکے پرتو سے وہ بلد عظیم، یعنی ہمارا مسکن قدیم محروم رہا جاتا ہے یہ خیال کرکے بے اختیار خاطر میں آتا ہے کہ وہاں پر بھی، اس کی ایک شاخ رکھی جائے اور وہاں بھی یہ ساری تدبیر عمل میں آئے کہ یتیم بھی پرورش پائیں گے، وہاں کے لوگ بھی بہ خوشی تمام و رضائے مالا کلام اس کے چندہ دینے میں اپنی اپنی ہمت بتائیں گے، کیونکہ اپنے اہل شہر مستحق ہوتے ہوئے، وہ دوسروں کی امداد کے دم بھرنے میں اور بے دیکھی اور گمانی بات پر چندہ کر لینے میں آج کل کے لوگوں کی رائے مختلف ہے اور میری دانست میں وہ ضرور یہی عذر پیش فرمائیں گے اور پس پا ہو جائیں گے۔ اس واسطے چاہیے کہ ہر یک شہر کے لئے ایک خاص بندوبست کیا جائے۔ آپ کی کوشش میں خدا برکت عطا فرمائے۔

خط کے نیچے نام درج نہیں ہے، اور تاریخ بھی نہیں لکھی ہے۔ اس کے بعد ایک خط موسومہ مولوی عون الدین صاحب درج ہے جس پر تاریخ ۱۶ ربیع الثانی ۱۲۹۵ھ مندرج ہے۔

اداریہ

ادبی مسایل

(۳)

ادھر ٹیگور کے فکر و فن پر کچھ اچھی کتابیں دیکھنے اور بلند پایہ تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ایک بات پر کئی لوگوں نے زور دیا ہے۔ ٹیگور اور گاندھی صرف بیسویں صدی کے سب سے بڑے ہندوستانی ہی نہیں۔ کئی صدیوں میں ہندوستان میں جو بڑے آدمی گزرے ہیں ان میں سے ہیں۔ ٹیگور بنیادی طور پر فنکار تھے، گاندھی جی بنیادی طور پر سیاسی رہنما۔ دونوں کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اور ایک کو دوسرے سے ٹکرانے کی کوشش غلط ہے۔ ہاں یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اور اس نے مغربی تعلیم کے اداروں، مغربی ملوں سے بنے ہوئے کپڑے اور عام طور پر ہر مغربی چیز کی مخالفت کا روپ اختیار کیا تو ٹیگور نے اس کی مخالفت کی۔ گاندھی جی وردھا سے چل کر شانتی نکیتن پہنچے۔ دونوں میں خوب بحث ہوئی اور اس کے بعد گاندھی جی نے ٹیگور کو ینگ انڈیا میں ایک عظیم محافظ کے نام سے یاد کیا۔ اچھوت ادھار کی تحریک کے سلسلے میں، کھدر کے ساتھ ایک روحانیت وابستہ کرنے میں ٹیگور نے گاندھی جی کی مخالفت بے دھڑک کی۔ گاندھی جی نے گیتا پر بہت زور دیا۔ ٹیگور نے بدھ مت اور اپنشدوں پر زور دیا۔ فنکار نے سیاسی رہنما کی عظمت کا اعتراف کیا۔ اس سے اثر بھی قبول کیا، مگر جب کبھی فنکار کو یہ نظر آیا کہ سیاسی تحریک انتہا پسندی کا شکار ہو رہی ہے تو اس نے اپنی آواز بلند کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کیا۔ ٹیگور کی زندگی میں ہمیں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ فنکار اور سیاست کا کیا تعلق ہے۔ ٹیگور اپنے دور کی کسی سیاسی تحریک سے منہ موڑ کر نہیں بیٹھے۔ جب ضرورت پڑی تو انھوں نے سیاسی جلسوں میں شرکت کی۔ سیاسی پلیٹ فارموں سے اپنی بعض بہترین نظمیں سنائیں، سیاسی اقدامات کو سراہا یا ان پر معترض ہوئے، ساری دنیا کی سیر کی، ہر سیاسی نظام کو دیکھا اس کے اچھے پہلوؤں کی تعریف کی۔ مگر کسی سیاسی فارمولے میں اسیر نہیں ہو سکے۔ فنکار کے ذہن کو کسی سیاسی بوتل میں اسیر کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔ فنکار کے لئے سیاسی شعور ضروری ہے، کیونکہ سیاسی شعور نہ ہو تو وہ زندگی کی سمت اور تبدیلیوں کی رفتار پر نظر نہیں رکھ سکتا اور ان کا بھرپور جائزہ نہیں لے سکتا۔ پر سیاسی شعور اگر کسی سیاسی پارٹی کے پروگرام میں شرکت اور سیاسی کاموں میں مصروفیت کی طرف لے جائے تو یہ علیحدہ بات ہے۔ یہ ایک غیر متعلق بات ہے اس کا فن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ فن کو اس سے تقویت پہنچتی ہے نہ اس سے فن پر حرف آتا ہے۔ وہ لوگ جو سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اس تعلق کی وجہ سے اچھے فنکار نہیں ہیں۔ جو لوگ سیاسی پارٹیوں سے بے تعلق ہیں، وہ اس بے تعلقی کی وجہ سے اچھے فنکار نہیں ہوتے۔ سیاسی پارٹی سے رشتے اور تعلق اور سیاسی شعور میں فرق ہے۔ فنکار میں ایک ایسی ذہنی ہمدردی ہوتی ہے کہ وہ ہر پارٹی یا پروگرام سے ایک اپنا مخصوص رشتہ قائم کرسکتا ہے، مگر اسکے فن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ذہنی طور پر اس پارٹی یا پروگرام سے بلند ہو سکے تاکہ اس کے حسن و قبح پر نظر ڈال سکے۔ فنکار پرانی قدروں سے ہمدردی رکھ سکتا ہے مگر یہ ہمدردی اگر اسے ماضی کو حال پر مسلط کرنے یا حال کی تبدیلیوں کو اور امکانات کو نظر انداز کرنے کی طرف لے جاتی ہے تو بری ہو سکتی ہے۔ فنکار کے ذہن کو منجمد کرسکتی ہے، اسے روایت پرست بنا سکتی ہے۔ ہاں اگر یہ ماضی کی کچھ اچھی قدروں کی توسیع یا ترقی چاہتی ہے مگر ماضی میں یکسر گم نہیں ہے تو مفید ہے۔ اسی طرح فنکار اگر سیاسی پروگرام کا اسیر ہو جاتا ہے تو اس کا فن پٹری پر چلنا ہو جاتا ہے۔ فن سیاسی پٹری پر چلنے کا نام نہیں ہے زندگی کی پٹری پر چلنے کا نام ہے، جس کے لئے دو گز لمبی پٹی کی لکیر کافی نہیں فطرت اور زندگی کے پست و بلند سے گزرنا ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے اس خدمت کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مگر اسکے کچھ پرجوش اور ناسمجھ مبلغوں نے ترقی پسند تحریک کو کمیونسٹ پارٹی کے پروگرام سے ملا دیا۔ یہ بڑی غلطی تھی۔ ضروری نہیں کہ کوئی کمیونسٹ ہو کر ہی اچھا فنکار ہو۔ اچھے فنکار کے لئے تو یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے پاس نظریہ ضرور ہو۔ ہاں نظریے سے اسے مدد مل سکتی ہے۔ مگر ایسے بڑے فنکاروں کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو کسی نظریے کے پابند نہیں رہتے ہاں جنھوں نے نظریے سے قابل قدر پہلو اخذ کئے تھے۔ ٹیگور کے یہاں بھی کوئی ایک نظریہ نہیں ہے۔ ہاں ان کے یہاں کئی نظریوں کی حمایت اور چند کی مخالفت ملتی ہے۔ فنکار انسان، سماج اور تہذیب کا ضمیر ہوتا ہے۔ وہ اسکی اپنے طور پر خدمت کرتا ہے، اپنے طور پر خدمت کے لئے اسے دوسروں کی خدمت کے طریقوں کا علم ہونا چاہئے مگر ان طریقوں کی غلامی ضروری نہیں۔ اس کا تعلق ایک آزاد تعلق ہے، اس کا رشتہ ذرا وسیع ذرا بلند ذرا گہرا رشتہ ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں یہ طریقت کا رشتہ ہے۔ وہ انسانیت، تہذیب اور سماج کا اتنا سچا وفادار ہے کہ بعض اوقات کسی خاص رشتے سے بلند نظر آتا ہے، اسے کبھی کبھار کسی خاص رشتے کی نفی بھی کرنی پڑتی ہے۔ زبان کی بات ہو تو وہ زبان کو بت سمجھ کر اسکی پرستش نہیں کرتا، قومیت کا نام لیا جائے تو وہ جارحانہ قومیت کا حامی نہیں ہو جاتا، بین الاقوامیت کے نام پر وہ قومیت کے

فطری احساس کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اخلاق کا ذکر آئے تو وہ اخلاق کا علم بردار ہوتے ہوئے اخلاق کے کسی رسمی اور محدود تصور میں اسیر نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت کے نام پر وہ اکثریت کی آمریت کو نہیں مان سکتا۔ سیاسی رہنماؤں کو وہ ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا کر پیش کریں۔

ادیب آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔ وہ زندگی، ارتقاء، انسانیت، مادی اور روحانی آسودگی کے خوابوں کا پابند ہے وہ ان کی تعبیروں سے اتفاق بھی کرسکتا ہے اور اختلاف بھی۔ وہ صرف حال سے رشتہ نہیں جوڑتا۔ اس کا رشتہ ماضی، حال، مستقبل تینوں سے ہے۔ آزادی کے نام پر اسے اپنی خودی کی مطلق العنانی کا اعلان کرنے کا حق نہیں۔ پابندی کے نام پر کسی کو اس کی روح کے کچلنے کا حق نہیں۔ یہ الفاظ کی بازیگری نہیں ہے۔ حقیقت کے دونوں رُخ دیکھنے اور دکھانے کی کوشش ہے۔ کوئی حقیقت یک رخی نہیں ہوتی، ہاں یہ ہوتا ہے کہ جب ایک رخ کی پرستش بڑھ جائے تو ردِ عمل کے طور پر دوسرا رُخ زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی اسی طرح عمل اور ردِ عمل سے آگے بڑھتی ہے۔ یہ کارواں اسی طرح ہچکولے کھاتا ہوا چلتا ہے۔

باسط بھوپالی کا انتقال

بھوپال۔ ۱۰ر دسمبر۔ ولی رنج و غم اور افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جا رہی ہے کہ بھوپال کے بزرگ اور منفرد غزل گو باسط بھوپالی کا ۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ مرحوم گذشتہ ۶ ماہ سے مرضِ کینسر میں مبتلا تھے۔

ادھر ادھر سے

بھگوت گیتا کا جرمن ترجمہ

سٹٹ گارٹ۔ (ڈاڈ) بھارتی ادب و فن، شاعری، فہم و فراست کے جرمن دوستوں کی خاطر سٹٹ گارٹ کے ایک مشہور ناشر ہنس، ای۔ گنتھر نے ان ہی دنوں میں بھگوت گیتا کا جرمن ترجمہ شائع کیا ہے۔ سنسکرت اور جرمن زبان میں شائع کردہ اس کتاب کا دیباچہ بنگلور کے ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ دنتھا رام نے لکھا ہے جو اپنے متعدد لیکچروں کے باعث مغربی جرمنی میں خاص شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ اپنے دیباچہ میں بھارتی مدبر نے بھگوت گیتا کے گہرے عقلی اور فہمی ادراک اور اس کی تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کو بھارت کی روایات کے عنوان سے جرمن قارئین سے متعارف کرایا ہے۔ جو بنی نوع انسان کو آزادی فکر، خوف خدا اور انسانی مسائل کو پرکھنے کا سبق دیتی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ناشر نے بھگوت گیتا بعینہٖ رومن سنسکرت میں بھی شائع کیا ہے تاکہ جرمن قارئین اس بھارتی کلاسیکل ادب کو سنسکرت میں پڑھ کر اس کے گہرے خواص سے مستفید ہو سکیں۔

انڈین سائنس کانگرس میں برطانوی کتابوں کی نمائش

معلوم ہوا ہے کہ ماہ جنوری میں انڈین سائنس کانگرس کے موقع پر برٹش کونسل برطانیہ کی ۲۵۰ سے زائد سائنسی و ٹیکنیکل کتابوں کی نمائش منعقد کرے گی۔ یہ سب کتابیں ایسی ہیں جو سنہ ۱۹۷۰ء کے موسم خزاں سے لے کر اب تک شائع ہوئی ہیں۔ مذکورہ سائنس کانگرس کٹک میں ہو گی۔

"مرقع اُردو" کی اشاعت

حیدرآباد۔ یکم دسمبر۔ آندھرا پردیش اُردو کانفرنس کے موقع پر جو ۲۳-۲۴ اور ۲۵ر دسمبر کو منعقد ہو رہی ہے ایک ساوونیر "مرقع اردو" بھی شائع کیا جائیگا۔ اس ساوونیر میں انجمن ترقی اُردو، اردو ہال اور ریاست میں اُردو کے موقف مقام اور تعلیم اور نظم و نسق میں اردو اور اردو تنظیموں کے تعلق سے مکمل مواد اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ ممتاز ماہرین تعلیم اور اہل قلم حضرات سے مضامین لکھنے کی درخواست کی جا رہی ہے۔ ساوونیر کی ترتیب کا کام مسٹر رحمت علی کے سپرد ہے۔ یہ ساوونیر ۲۰ر دسمبر کو شائع کردیا جائے گا۔

ہندوستانی ادب روسی زبان میں

ماسکو۔ ۸ر دسمبر۔ گذشتہ چند برسوں میں ہندوستان کے کلاسیکی اور جدید ادب کا سوویت یونین میں کافی ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سوویت یونین کے لوگ اپیندر ناتھ اشک کے نام سے بخوبی واقف ہیں جن کا ناول "ٹوٹے تارے" کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ایلیا چند رجوشی کے ہندی ناول "آوارہ" کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ اور اس کی پچاس ہزار جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ حال ہی میں ملیالم کے ادیب سیوا شنکر پلے۔ ہندی کے ادیب موہن راکیش اور مارکنڈے کی کہانیوں کے مجموعے بھی روسی زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ تامل کے ادیب چدامبرم کی ۲۲ کہانیاں روسی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندی کے مشہور شاعر نرالا کی نظموں کا مجموعہ روسی زبان میں شائع ہو چکا ہے اور اب دوسرا انتخاب شائع ہونے والا ہے۔

ایک ایکٹ کے ناٹکوں کا ایک مجموعہ روسی زبان میں شائع ہوا ہے۔ جس میں ہندی۔ اردو۔ بنگالی۔ پنجابی کے ناٹک شامل ہیں۔ ہندوستان کی لوک کہانیاں روسی زبان میں کئی بار شائع ہو چکی ہیں۔

ضروری اعلان:- براہ مہربانی خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

غزل

سید حرمت الاکرام

زمین درد میں جنت کشش تباہی ہیں
یہ حال یوں ہے کہ ہم وقت کے سپاہی ہیں

نہ سہی عرضِ تمنا نہ شکوۂ غمِ دل
ترے حضور بھی ہم جو عذر خواہی ہیں

معاف کر نہ سکی ہم کو فطرتِ آدم
خطا یہ ہے کہ خطا وار بے گناہی ہیں

چمن میں ان کیلئے ایک پنکھڑی بھی نہیں
چمن کے واسطے جو بادِ صبح گاہی ہیں

جو ہو سکے تو ہمیں دو پیامِ دار و رسن
کہ ہم بھی منکرِ آئینِ کج کلاہی ہیں

یہ چاہتے ہیں کہ منزل کھنچ آئے قدموں میں
بڑے عجیب تری رہ گزر کے راہی ہیں

بتا رہا ہے اشاروں سے صبح کا تارا
سیاہ رات کی ہم آخری گواہی ہیں

ہے جن سے آپ کو افشائے راز کا خطرہ
وہ لوگ موردِ الزامِ کم نگاہی ہیں

لرز رہی ہیں جو حرمت افق کے دامن پر
وہ شوخ کرنیں بھی منجملۂ سیاہی ہیں

غزل

مظفر عباسی آزاد

اُن آنکھوں کو سکھلایا ہے فن شیشہ گری کا
اُن ہونٹوں کو پیمانہ شکن ہم نے کیا ہے

پھر عشق میں وقت آہی گیا جرم و سزا کا
پھر تذکرۂ دار و رسن ہم نے کیا ہے

ہر غم کہ ہے پروردۂ آغوشِ مسرت
کانٹوں کو بھی مانوسِ چمن ہم نے کیا ہے

ہر دور کو تہذیبِ غمِ عشق سکھا کر
شائستۂ آدابِ کہن ہم نے کیا ہے

آزاد غمِ یار ہو وہ یا غمِ دوراں
ہر غم کو عطا حسنِ سخن ہم نے کیا ہے

غزل

واحد پریمی

تصورِ حسن کی بدولت مری شبِ غم کبھی ملے گی
تھکی تھکی جیسے صبح ہو گی نئی نئی روشنی ملے گی

میں روزِ اوّل سے جی رہا ہوں اسی اک امید کے سہارے
ابھی تری دشمنی ملی ہے کبھی تری دوستی ملے گی

اگر ہے عزمِ طلب مکمل، اگر ہے ذوقِ تلاش صادق
مجھے جنوں ہی کی رہ گزاروں میں منزلِ آگہی ملے گی

سُنا تھا ہم نے بہار آئی یہ کیا خبر تھی چمن میں واحد
ہر ایک گل کی شگفتگی میں لرزتی افسردگی ملے گی

کالیداس

جے کرشن چودھری

بلبلِ ہندوستاں! اے شاعرِ جادو بیاں
تو ہماری عظمت و تہذیب کا ہے ترجماں

گہری نظروں سے نہ دیکھا تو نے صرف انساں کا دل
بلکہ قدرت کے بھی دل کا تو تھا گہرا رازداں

تیرے شہ کاروں میں قدرت، آدمی اور جانور
چاہ کے رشتوں میں جڑ کر ہو گئے ہیں ایک جاں

تیرے گیتوں کو کبھی بھی موت آ سکتی نہیں
لازوال اُن کی کشش ان کی بہاریں جاوداں

تیرے علم و فضل کی شہرت ہے ایسی آج تک
جھک گیا قدموں پہ تیرے باادب سارا جہاں

غزل

عتیق احمد عتیق

مجھی سے پوچھ رہے ہیں وہ میرا حالِ زبوں
تو کیا میں اپنی تباہی پہ روشنی ڈالوں

زبانِ حال سے دے کر مجھے پیامِ سکوں
ترے خیال نے کچھ اور کر دیا محزوں

سُنا کہ "وجہِ طلوعِ سحر ہیں اہلِ جنوں"
تو خود ہی ٹوٹ گیا "تیرگیِ شب کا فسوں"

جنونِ شوق کی عظمت پہ طنز فرما کر
بڑھا گئے ہیں وہ کچھ اور بھی وقارِ جنوں

غمِ حیات سے پامال ہو کے بھی ہم نے
غمِ حیات کو ہونے دیا نہ "خوار و زبوں"

جو تم کو فکرِ نظامِ چمن نہیں — یارو!
تو لاؤ میں ہی بہاروں کا اہتمام کروں

ہے جب سے گردشِ حالات پر نگاہ مری
میں خود بھی گردشِ حالات کی نگاہ میں ہوں

ترے سکوت کا مفہوم کون سمجھے گا،
ترے سکوت پہ میں بھی اگر خموش رہوں

عتیق! شاعرِ امروز ہی کہو نہ مجھے
کہ میں تو شاعرِ مستقبلِ حیات بھی ہوں

اُردو

اختر آغا لکھنوی

لٹتی ہوئی اُردو کو پھر بزم میں لانا ہے
ماضی کو بہرصورت اب حال بنانا ہے

اے جسمِ سخن پرور اے خلوتِ انسانی
اُترے ہوئے جامے کو پہنا کے دکھانا ہے

دو شعر

جوش حبیب پارس نگری

سرد جذبات ہوئے محفلِ ارماں چپ ہے
دل جو تھا آٹھ پہر وقفِ غزل خواں چپ ہے

آپ ہنستے ہیں تو تا حدِ نظر ہنستی ہے بہار
آپ چپ ہیں تو بہاروں میں گلستاں چپ ہے

مراسلات

تجصوتیہ یا صوتیہ

(۱) میں نے اپنی چند تحریروں میں phoneme کے لئے چودھری محمد نعیم کی اصطلاح تجصوتیہ استعمال کی تھی۔ عام قاری کے لئے یہ لفظ بڑا گھبرا دینے والا ہے۔ اب میری رائے ہے کہ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری کی اصطلاحات زیادہ موزوں اور سہل ہیں، انھیں اختیار کر لینا چاہئے۔ وہ اس طرح ہیں:-

صوت	PHONE
صوتیہ	PHONEME
ہم صوت	ALLOPHONE

(۲) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مطلع کرتے ہیں کہ سری نگر میں مشہور عالم لسانیات ڈاکٹر چٹرجی سے صوتیہ کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر چٹرجی نے کہا کہ صوتیہ کے لئے اگر مفرد لفظوں کی مثالیں نہ مل سکیں تو مرکب الفاظ کی مثالیں پیش کرنے میں قطعاً کوئی قباحت نہیں۔

(۳) چودھری محمد نعیم نے اپنے مراسلے (شائع شدہ ہماری زبان بابت یکم نومبر ۱۹۶۱ء) میں جس پُر زور الفاظ میں میری تائید کی ہے اس کے لئے میں موصوف کا شکر گزار ہوں۔　(گیان چند)

دیوان حضرت آسیؔ غازی پوری سکندر پوری

یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں جناب ابوعلی صاحب کا مضمون نظر نواز ہوا جہاں تک میں جانتا ہوں حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب آسیؔ غازی پوری سکندر پوری کے دیوان طبع اول و طبع دوم دونوں ہی کا نام دیوان آسیؔ المعروف بہ عین المعارف ہے۔ دیوان کے مرتب خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین جناب شاہ علی حلیمی رشیدی ہیں۔ طبع اول کا دیوان مرحوم مصنف کے وصال کے بعد بنارس میں ۱۹۱۰ء میں بڑی تقطیع پر طبع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ میرے پاس پٹنہ میں محفوظ ہے اور طبع دوم کے نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ کے الاصلاح لائبریری، السنہ سیکشن اور گورنمنٹ اُردو لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ طبع دوم چھوٹی تقطیع کے نفیس کاغذ پر خوشخط ۲۲۴ صفحوں میں چھپا ہوا مجلد ہے۔ اور آسی پریس گورکھپور میں طبع ہوا ہے۔ دیوان آسیؔ کا نام ایمان سخن نہیں ہے۔

ابوعلی صاحب کا یہ لکھنا کہ:

"ان کی زندگی کا بڑا زمانہ مدراس میں بھی گذرا تھا اسی لئے غازی پوری سکندر پوری کے ساتھ مدراسی بھی مشہور ہے"

میرے خیال میں بہت مشکوک ہے۔

عین المعارف میں حضرت آسیؔ کی مختصر سوانح عمری بھی درج ہوئی ہے اس میں حضرت آسیؔ کے مدراس جانے یا قیام کرنے کے متعلق کچھ نہیں درج ہے۔ میں نے کبھی بھی حضرت کے اسم گرامی کے ساتھ مدراسی لکھا ہوا نہیں دیکھا۔

آسی مدراسی ایک دوسرے بزرگ ہوئے ہیں جن کا نام نامی عبدالعلی تھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد عبدالعلی صاحب نے لکھنؤ میں توطن اختیار کر لیا تھا اور لکھنؤ ہی میں آسی پریس قائم کر رکھا تھا جو اپنے زمانے کا مشہور مطبع تھا۔ مولانا عبداللہ عمادی حضرت عبدالعلی آسی مدراسی ہی کے شاگرد تھے۔

ارباب غازی پور ان باتوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

(محمد بشیر الحق دسنوی)

نگارشات سلیم

مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کے انتقال کو ۳۴ سال ہو گئے ابھی تک ان کے مقالات کا مجموعہ "افاداتِ سلیم" اور نظموں کا مجموعہ "افکارِ سلیم" شائع ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے مولانا کے منتشر مقالات منظومات اور سوانح جمع کرنا شروع کر دیے ہیں جس کے لئے ادب دوست حضرات، احباب، تلامذۂ سلیم اور ان کے عقیدتمندوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۸ء تک کے اخبارات و رسائل کے فائل دیکھنا ہوں گے۔ خصوصاً تہذیب الاخلاق، معارف (جو مولانا نے ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے جاری اور ۱۹۰۰ء میں پانی پت لا کر بند کیا تھا) علی گڑھ میگزین، مخزن، ہمایوں، شباب اُردو، نیرنگ خیال، عالمگیر، نگار، زمانہ، شمع آگرہ، اُردو، مجلۂ عثمانیہ، زمیندار، سیاست، پیسہ اخبار، انقلاب، ہمدم، مسلم گزٹ، خلافت، الہلال، مدینہ، ریاست، تیج روزنامہ و ویکلی وغیرہ۔

مولانا نے پانی پت میں مطب بھی کیا تھا اور پریس بھی لگایا تھا جس سے کئی عربی ناولوں کے ترجمے بھی شائع کئے تھے۔ وہ بہاول پور ایجرٹن کالج میں ہیڈ مولوی، علی گڑھ میں سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ، لاہور میں روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر، جس میں ان کی کئی سیاسی نظمیں "ایک لبرل مسلمان" کے نام سے بھی چھپی تھیں۔ لکھنؤ میں روزنامہ مسلم گزٹ کے ایڈیٹر اور حیدرآباد دکن میں پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمۂ عثمانیہ رہے ہیں جہاں انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں۔ لہٰذا جن حضرات کے پاس مولانا کا کوئی مضمون، نظم، خط، فوٹو، ملاقات کا کوئی تاثر، کچھ حالات یا ان کے گمشدہ قلمی مجموعۂ کلام کا کچھ علم ہو جو ۱۹۲۳ء میں کسی نے اڑا لیا تھا تو وہ، اور مولانا کے احباب، تلامذہ براہ کرم راقم سے رابطہ پیدا کریں۔ تعاون کرنے والے حضرات کا ذکر مولانا کی تصنیف میں بھی کیا جائے گا، اور تمام ضروری اخراجات بھی شکریے کے ساتھ ادا کئے جائیں گے!

("افکارِ سلیم" بھی [illegible] میری ہی تحریک تعاون سے شائع ہوا تھا)

پتہ:- حکیم نور احمد [illegible]۔ کرنالی۔ ملتان

انجمن کا خبرنامہ

بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کا احتجاجی جلسہ

پٹنہ - ۲۰ر نومبر ۵ بجے شام کو انجمن اسلامیہ ہال میں ایک زبردست احتجاجی اجتماع منعقد ہوا جس میں اُردو، بنگلہ، اڑیا بولنے والے ۵ ہزار سے زیادہ تعداد میں تھے مسٹر بی۔ آر۔ داس ایڈوکیٹ لا کے اچانک علیل ہو جانے کے باعث جلسے کی صدارت جناب محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے فرمائی۔ یہ جلسہ پٹنہ یونیورسٹی کے حالیہ سرکلر کے خلاف جس کے ذریعہ یونیورسٹی امتحانات میں غیر لسانی پرچوں کا جواب ہندی یا لازمی قرار دئے جانے سے پیدا شدہ حالات اور لسانی اقلیتوں میں بڑھتی ہوئی بے چینی کے پیش نظر صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ۲۵ر اور ۲۶ر نومبر کو گیا، اورنگ آباد اور بہار شریف میں بھی زبردست احتجاجی جلسے ہوئے اور لسانی اقلیتی طلبہ کا زبردست جلوس نکلا جس میں سرکلر کے واپسی کا یونیورسٹی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا۔

انجمن اسلامیہ ہال کے اس شاندار احتجاجی جلسے میں ہر طبقہ کے لوگوں نے شرکت کی۔ جلسہ کی غرض و غایت مولانا میتاب صدیقی صاحب جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو نے بیان کی اور اس رسوائے زمانہ سرکلر کی تاریخ اور اس سلسلے میں انجمن کی سرگرمیوں پر مختصر طور پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد جناب محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ نے اپنی صدارتی تقریر میں یونیورسٹی کی آمرانہ لسانی تحریک کی وضاحت کی اور اس سلسلے میں اُردو کے مخالفین کے ان ہتھکنڈوں سے بھی عوام کو روشناس کیا جن سے عام طور پر اردو دوستی کے پردہ میں عوام کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ تفصیل کے ساتھ وائس چانسلر سے انجمن کے وفد کی گفتگو سے حاضرین کو آگاہ کیا۔ جناب غلام سرور صاحب ایڈیٹر سنگم نے حسب ذیل تجویز پیش کی جس کی تائید میں جناب حاجی ضیاء الرحمن ایم۔ ایل۔ اے پروفیسر رنگین ہلدار (بنگلہ مقرر) شری رامائن سنگھ چیرمین فارورڈ بلاک بہار اسٹیٹ۔ شری برج کشور پرشاد ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ، شری رام اوتار شاستری۔ شری سریندر دیو دبے پٹنہ یونیورسٹی اور جناب حفیظ اللہ نیولپوری (اڑیہ مقرر) وغیرہ نے تقریریں کیں اور پُرزور لفظوں میں یونیورسٹی کے اس اقدام کی مذمت کی۔

تجویز

پٹنہ کے شہریوں کا یہ جلسہ عام پٹنہ یونیورسٹی کی اس تجویز کو جو یونیورسٹی ریگولیشن میں ترمیم کے لئے لائی گئی ہے اور جس کے ذریعہ ۱۹۶۲ء سے یونیورسٹی امتحانات کے مختلف مدارج میں ہندی کو واحد ذریعہ امتحان قرار دیا جانیوالا ہے انتہائی تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس میٹنگ کی یہ قطعی رائے ہے کہ اگر ترمیم منظور کر لی گئی تو بہار کی لسانی اقلیتیں اور خاص طور پر اردو اور بنگلہ لسانی اقلیتیں امتحانوں کے تمام تر مدارج میں اپنی مادری زبان میں سوالوں کا جواب لکھنے کے اپنے بنیادی اور سابق دستوری حق سے محروم ہو جائیں گی۔ اس میٹنگ کی رائے میں ۱۹۶۵ء تک انگریزی میں جواب دینے کی سہولت کی اجازت اس مسئلہ کا حل نہیں ہے اور کسی صورت میں بھی لسانی اقلیتوں کی دشواریوں کے حل میں معاون نہیں ہو سکتی۔

لہٰذا یہ جلسہ عام یونیورسٹی اور حکومت کے متعلقہ ارباب حل و عقد سے پُرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مجوزہ ترمیم کو ترک کر دے اور واضح طور پر اعلان کرے کہ لسانی اقلیتوں کو انکی مادری زبان میں جواب دینے کی سہولت کا بنیادی اور سابق دستوری حق قائم و دائم رہے گا۔

جناب بی۔ آر۔ داس۔ بار ایٹ لا۔ پٹنہ کا حسب ذیل خطبۂ صدارت ان کی اچانک علالت کے سبب پڑھ کر سنایا گیا۔

دوستو!

اپنے ضعف پیری اور علالت کے باوجود میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں آج کے اس جلسہ میں شرکت کروں جو پٹنہ یونیورسٹی کے اس نہایت نقصان دہ اقدام کے خلاف بطور احتجاج کیا جا رہا ہے کہ ۱۹۶۲ء سے ذریعہ امتحانات (یعنی امتحان میں جواب لکھنے کی زبان) صرف ہندی زبان ہوگی اور جس کا اعلان پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو کر دیا ہے یہ اقدام لسانی اقلیتوں کے مستقبل پر بری طرح اثر انداز ہوگا اور ہندوستانی قوم کی بقا باہم آہنگی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔

یہ امر عام طور پر مسلّم ہے کہ امتحان دہندگان اپنی قابلیت کا اظہار اپنی مادری زبان میں بہترین طور پر کر سکتے ہیں۔ اُردو اور بنگلہ بولنے والے طلبہ سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ امتحان میں سوالوں کے جواب صرف ہندی یا انگریزی میں لکھیں جو ان کی مادری زبان نہیں ہے ایک امتیازی سلوک (یعنی دوسرے قسم کا برتاؤ) ہے، اور ان کے امتحان پاس کرنے میں سدِّ راہ ہوگا۔ ہندوستان ایک کثرت السنہ (بہت سی زبانوں کا) ملک ہے۔ اور دستور ہند نے چودہ قومی زبانوں کو تسلیم کیا ہے۔ ان میں سے ہر زبان برابری کا دعویٰ کرتی ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی بہار کی سرکاری زبان ہے اور بہار کے ہر شہری کو ہندی زبان سیکھنا ضروری ہے

یہاں کی تمام اقلیتوں کو ہندی پڑھنا پڑتا ہے اور ہندی کے ایک لازمی پرچہ کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے اور کالجوں میں ہندی زبان میں لکچروں کو بھی سُننا پڑتا ہے لیکن وہ نصاب کی کتابیں اپنی مادری زبان میں ہی پڑھتے ہیں اور ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ ہر مضمون کے امتحانات میں وہ سوالات کے جواب اچھی طرح ہندی میں دے سکیں گے۔ اسکولوں میں انھیں اجازت ہے کہ وہ سوالات کے جواب اپنی مادری زبان میں لکھیں۔ اسکول کا آخری امتحان دے کر جب وہ کالج میں آتے ہیں تو یکایک ان سے یہ کہنا کہ وہ امتحان میں جواب ہندی میں لکھیں نہایت لغو اور احمقانہ مطالبہ ہے۔ اگر اسکول کے ارباب اقتدار شروع ہی میں طلبہ سے امتحانات میں سوالات کے جواب ہندی میں لکھنے پر اصرار کرتے تو آگے چل کر انھیں اتنی دقت نہ ہوتی یہ نہایت عجیب بات ہے کہ یونیورسٹی طلبہ کو سنہ ۱۹۶۵ء تک انگریزی میں تو جواب لکھنے کی اجازت دیتی ہے حالانکہ وہ ایک بدیسی زبان ہے اور ملک کی دو قومی زبانوں یعنی اُردو اور بنگلہ میں لکھنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

آج کل قومی یکجہتی کی بات بہت سننے میں آتی ہے لیکن لسانی اقلیتوں کا جو یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار اپنی مادری زبان میں کریں اس سے انھیں محروم رکھنے اور اس طرح ان کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے سے انھیں اس کا احساس ہونا ضروری ہے کہ وہ دوسرے درجہ کے شہری سمجھے جاتے ہیں اور انھیں اکثریت کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ فوقیت رکھنے والی اکثریت خود اس حالت میں لسانی اقلیت پر حقارت کی نظر کرم ڈالنے لگے گی۔ میں یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ اقلیتوں کے خلاف اس قسم کا امتیازی اور ناروا قاعدہ بنا کر اور ان کی تعلیمی ترقی میں روڑا اٹکا کر کیا فائدہ حاصل کریں گے۔

مجھے یقین ہے کہ ملک کے اندر ایسے لوگ بھی ہیں جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو کثرت میں وحدت کا نمونہ سمجھتے ہیں اور ہندوستانی قومیت پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں ان کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ اقلیتوں کی راہ میں مشکلات پیدا کرنا اس قومی اتحاد کے لئے مضر ثابت ہوگا جس کو تعلیم کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے اور جو تعلیم کا خاص مقصد ہے۔ (نامہ نگار)

تصحیح

یکم دسمبر ۶۱ء کے "ہماری زبان" میں مولانا عشرت گیلانی کی دو رباعیات بعنوان قطعات غلطی سے میرے نام سے شائع ہو گئی ہیں۔ ہماری زبان کے پڑھنے والے تصحیح کرلیں۔ (محمد تقی اثر امروہوی)

نقل گشتی مجریہ دفتر انجمن ترقی اُردو راجستھان

بنام

مقامی شاخہائے راجستھان

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے انجمن ہٰذا اپنے مطالبات کی منظوری کے سلسلے میں لسانی اقلیاتی کمشنر، حکومت ہند اور حکومت راجستھان سے مسلسل خط و کتابت کر رہی ہے۔

حال ہی میں انجمن ہٰذا کے خط نمبری F.25/197/60-61 مورخہ ۲۶ر ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء کے جواب میں کمشنر موصوف نے ایک تفصیلی خط نمبری 27/2/61/1489 مورخہ ۹ر نومبر سنہ ۱۹۶۱ء بھیجا ہے۔ گو یہ خط ہمارے مقاصد کے حصول کے لئے ناکافی ہے۔ تاہم امید افزا ضرور ہے۔

ہم نے ان کے سامنے اُردو کے جو مسائل رکھے تھے ان میں سے کئی کی بابت وہ ریاستی حکومت سے تحقیق کر رہے ہیں اور اسکو اس جانب توجہ دلا رہے ہیں کہ حکومت یہ دیکھے کہ اس کے ماتحت حکام احکام کی پابندی کر رہے ہیں یا نہیں۔

کمشنر صاحب کے خط میں جن اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں سے چند کا ترجمہ آپ کی اطلاع کے لئے ارسال ہے۔ ہماری جد و جہد بدستور جاری ہے اور ہم اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں گے جب تک ہمارے تمام مطالبات تسلیم نہ کرلئے جائیں۔

آپ بھی براہ مہربانی۔ اس سلسلے میں ذاتی طور پر بھی خصوصی دلچسپی لیں اور یہ بات دیکھیں کہ ماتحت حکام کس حد تک جاری شدہ احکام کی پابندی کر رہے ہیں۔ اگر کوئی کمی ہو یا کوئی دقت پیش آئے تو انجمن ہٰذا کے علم میں لائیں۔

دستخط احترام الدین احمد شاغل

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ راجستھان (جے پور)

<u>ترجمہ پیرا نمبر ۹۔ پوائنٹ نمبر ۲۔ و پیرا نمبر ۹ پوائنٹ نمبر ۵</u>

دستور ہند کی دفعہ ۳۵۰ کی رو سے ہر شخص کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ وہ درخواست اس زبان میں پیش کرے جو زبان کسی صوبے میں استعمال کی جاتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے ریاستی حکومت نے اس کی بابت ضروری احکام جاری کر دئے ہیں اب اس کی توجہ اس ضرورت کی طرف دلائی جارہی ہے کہ اس کے احکام کی تعمیل ماتحت دفاتر پابندی سے کریں!

عدالتوں میں درخواستیں پیش کرنا دستور کی اس دفعہ کے تحت نہیں آتا۔

جہاں تک دستاویزات کے پیش کرنے کا تعلق ہے۔ لسانی اقلیاتی کمشنر اس بات سے متفق ہیں کہ حکومتوں کو اُردو یا اور کسی اقلیاتی زبان میں لکھی ہوئی دستاویزات کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔

اس معاملہ میں ریاستی حکومت سے مکرر پوچھ تاچھ کی جارہی ہے۔

<u>پیرا نمبر ۱۱ تا ۱۳</u>

ریاستی حکومت نے اطلاع دی ہے کہ (اردو کے) ٹیچروں کو ٹریننگ دینے کے سلسلے میں اقدام کئے جارہے ہیں۔ ریاستی حکومت سے اس بابت تفصیلات پوچھی گئی ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اُردو میں علاقائی خبریں نشر کرنے کا مطالبہ

آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے تلگو کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی علاقائی خبریں نشر کرنے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ جناب ایم باگا ریڈی ایم۔ ایل۔ اے (ظہیرآباد) ایا راؤ شنکر ایم۔ ایل۔ اے (نارائن کھیڑ) اور جناب عبدالجبار خاں نائب صدر انجمن تحفظ اُردو نے ایک مشترکہ صحافتی بیان کے ذریعہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اُردو میں بھی علاقائی خبریں نشر کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کی جانب سے حال ہی میں جالندھر ریڈیو سے پنجابی میں علاقائی خبروں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اُردو خبریں نشر کرنے کے متعلق لاکھوں اُردو بولنے والوں کے ایک دیرینہ مطالبہ کو نظرانداز کیا جائے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کو مختلف ریاستوں کی لسانی پالیسی کی روشنی میں اپنا نشریاتی پروگرام مرتب کرنا چاہئے۔ ان قائدین نے حکومت آندھرا پردیش بالخصوص چیف منسٹر سے اس مطالبے کی یکسوئی کے سلسلے میں مرکزی حکومت کو متوجہ کرنے کی اپیل کی ہے۔

(سیاست حیدرآباد)

انجمن ترقی اُردو مالیگاؤں کی ماہانہ ادبی نشست

مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۶۱ء (سنیچر) شب میں دس بجے شعبۂ ادب انجمن ترقی اُردو شاخ مالیگاؤں کی چوتھی ادبی نشست ہندوستان لائبریری میں منعقد ہوئی جس کی صدارت نذیر احمد صاحب نے کی۔ پروگرام کے مطابق :-

(۱) گذشتہ نشست کی رپورٹ منظور کی گئی۔ (۲) محمد عمر صاحب نے "موجودہ تحریکات کی ایک جھلک" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ (۳) عبدالواحد انصاری صاحب نے ایک انگریزی ناول کا اقتباس ترجمہ کرکے پیش کیا، جس کا عنوان "اِستا اور آزادی" تھا۔ (۴) سلطان سبحانی نے اپنا مزاحیہ افسانہ سنایا "تو تی کہاں کمند"۔ (۵) کبیر "شاعر انسانیت" کے موضوع پر سلیمان انصاری نے مقالہ پیش کیا۔ اور (۶) تاباں مالیگانوی نے ایک غزل سنائی۔ جن پر تنقیدیں ہوئیں اور لکھنے والوں کو مناسب مشورے دیے گئے۔

[سکریٹری انجمن ترقی اردو مالیگاؤں (ناسک)]

شاد کی کہانی شاد کی زبانی

مرتبہ : پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

کتابت و طباعت عمدہ، سائز ۲۲×۱۸

قیمت۔ پانچ روپے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

احمد آباد میں ادبی جلسہ

راشٹریہ ایجوکیشن ایسوسی ایشن، اور انجمن ترقی اُردو (احمد آباد) کی جانب سے ۳ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو انجمن اسلام ہائی اسکول میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض جناب مصطفےٰ میاں صاحب قادری نے انجام دیے۔ حیدرآباد سے تشریف لائے ہوئے اردو کے مشہور شاعر جناب سکندر علی وجد صاحب نے علامہ اقبال کی شاعری پر تقریر فرمائی۔ وجد صاحب نے بڑے بے تکلف انداز میں ۲ گھنٹے تک علامہ اقبال کی شاعری پر پُر از معلومات باتیں کیں۔

اس کے بعد جناب محمد علوی نے اپنی دو نظمیں "شکست" ـ "میرا مناؤ" ایک تازہ غزل سنائی، جو بے حد پسند کی گئیں۔ اس کے بعد عادل منصوری نے اپنی نظمیں "ننھی چڑیا" "اور" "میں اور تو" سنائیں۔

آخر میں وجد صاحب نے ایک غزل اور ایک طویل نظم "کاروانِ زندگی" سنائی جو بہت پسند کی گئی۔

پروفیسر وارث حسین علوی نے اپنے مخصوص انداز میں اقبالیات پر تقریر فرمائی۔ آخر میں جناب صدر نے وجد صاحب اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

(عادل منصوری)

"دائرۂ فکر و نظر" کی ہفتہ وار نشست

۳ر دسمبر ۱۹۶۱ء کی دوپہر کو "دائرۂ فکر و نظر" کی ہفتہ وار تنقیدی نشست زیر صدارت جناب نعمان ہاشمی ایم۔ اے، پروفیسر جناب سید فریدالدین احمد منعقد ہوئی۔ شوہر گیاوی اور نعمان ہاشمی کی مزاحیہ غزلوں نے حاضرین کو کافی محظوظ کیا۔ رہبر خالدی کی نظم "بازار حسن" پر سیر حاصل تبصرہ ہوا اور دائرے نے اسے اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیا۔ پروفیسر افصح ظفر ایم۔ اے کے افسانے "اور محل گر پڑا" نے تنقیدی بحث میں کافی وقت لے لیا۔ آخر میں جناب فرحت القادری اور حضرت منیر بھوجپوری نے نہایت حسین و کامیاب غزلیں سنائیں جنھیں تنقید و تبصرے سے بے نیاز سمجھا گیا۔

نشست کے اختتام پر دائرے کی طرف سے حاضرین کی تواضع ہلکے ناشتے اور چائے سگریٹ سے کی گئی۔

(معتمد "دائرۂ فکر و نظر" گیا)

ضروری گذارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ کے پتہ پر فرمایئے

سید مجیب الرحمٰن

گذشتہ سے پیوستہ

جمالیات کی مادی بنیاد اور اس کا مقصد

ہیگل کا یہ تصور بھی ناقابلِ قبول ہے کہ آرٹ کی مدد سے انسان حسن کو تلاش کرتا ہے کیونکہ جذبہ اور ہیئت یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ موسیقی جو جذبہ پیدا کرتی ہے حسن کے پیدا کرنے کے جذبے سے بالکل عاری ہوتی ہے۔ گویا آرٹ کا لازمی فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس حقیقت کی آئینہ داری کرے جس میں انسان کے لئے دلچسپی ہو یا زیادہ سے زیادہ وہ حقیقت کی غیر موجودگی میں اس کا بدل کا کام کرے۔ اس طرح آرٹ کے تعلق سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کا دائرہ صرف حسن کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ ہر اس شے کو اپنے گھیرے میں لیتا ہے جو انسان کے لئے عام دلچسپی رکھتی ہو اور اس لئے آرٹ کی خوبی کو جانچنے کے لئے یہی اصول کارفرما ہوتا ہے کہ مخصوص شاہکار کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

چرنیشفسکی کو مرے ہوئے (۷۲) سال ہوتے ہیں مگر ابھی تک جمالیات کے علم میں ویسا انقلابی اضافہ نہیں ہو سکا جیسا کہ اس مفکر نے اس علم کی بنیادیں رکھنے میں صرف کی ہیں۔ چرنیشفسکی نے حسن کی سائنٹفک بنیاد بنا کر مقصدی علم کی بڑی خدمت کی ہے مگر اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ جمالیاتی ذوق کے مقصد کی بنیاد ٹٹول جائے۔

حسن جب مقصد نہیں ہے اور ذریعہ ہے تو حسن کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے ایک حقیری تحقیق کی کوشش کی ہے اور اسے اپنے مقالے؛

"Functional and aesthetic relation of human form to personality"

میں پیش کیا ہے۔

میں نے جمالیاتی حس کے مقصد کی تلاش میں سب سے پہلے انسانی شکل اور اس میں پوشیدہ شخصیت اور کردار کا جائزہ لیا ہے۔ سب سے پہلے میں نے (۲۳۰۰) برس پرانے یونانی حکمت کے ایک عظیم مفکر ہپاکریٹس (Hippocratus) کی کوششوں کو سراہا ہے کہ اس نے انسانی جسم کو ہیئت کی بنیاد پر دو واضح خانوں میں بانٹا ہے۔ گول چہرہ اور جسم (بنیادی ساخت کے اعتبار سے) کو اس نے (Pyknic) "پکنک" کا نام دیا ہے اور لمبوترے چہرے اور جسم کو (Leptosomes) "لپٹوسم" بتایا ہے۔ گول چہرہ والے جسم کی خصوصیات کے بارے میں اس نے یہ بتایا ہے کہ ایسے افراد خون کے دباؤ کی بیماریوں کے شکار ہوتے ہیں۔ اور اگر دماغی بیمار ہوں تو جنون اور طبیعت کی پستی (Manic depression) کے شکار ہوتے ہیں۔ اور زیادہ تر حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ جنون اور طبیعت کی پستی کی حالتوں میں بھی وہ خود کو حقیقت پسند ظاہر کرتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ پھرتیلے اور جذبات کا اظہار کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے جسم کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر طرف سے گول مول نظر آتے ہیں۔ درمیانی عمر میں ان کا پیٹ بڑھا ہوا ہوتا ہے اور سر کے بال جھڑ جاتے ہیں۔ جسم پر چربی کی تہ پھیلی رہتی ہے اور جسم کے پٹھے واضح شکل میں نہیں ہوتے۔

اس کے برخلاف لمبوترے چہرے کے افراد دبلے پتلے ہوتے ہیں اور دیکھنے میں نازک اور لمبوترے نظر آتے ہیں۔ درمیانی عمر میں ان کا پیٹ بڑھا ہوا نہیں ہوتا۔ اور سر کے بال جھڑتے بھی ہیں تو بہت کم۔ ایسے لوگ بیمار ہوں تو زیادہ تر دق کے شکار ہوتے ہیں۔ اور دماغی بیمار ہوں تو خاموش خاموش آہیں بھرنے والے (Schizophrenania) کے شکار ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں مریض حقیقی دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنی ایک علیحدہ تنہائی اور خواب کی دنیا بسا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر روگ شدت کا ہو تو خارجی دنیا اور دماغ میں توسط بھی باقی نہیں رہتا۔

لمبوترے چہرے (Leptosome) کا فرد رازداری برتنے والا، منکسر اور روزمرہ زندگی کے گھریلو اور سماجی رشتوں سے بیگانہ رہتا ہے۔ شدید بیماری کی حالت میں وہ ایک ضدی اور ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے اور کھانا پانی بند کر دیتا ہے۔ وغیرہ

واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کی مزاج کے مطابق یہ تقسیم بہت سائنٹفک اور اعداد و شمار کے مطابق بالکل درست ثابت ہوئی ہے۔ البتہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ کوئی بھی فرد مکمل "پکنک" اور مکمل "لپٹوسم" خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا، کیونکہ یہ تقسیم انسانی نفسیات مزاج اور خصوصیات کی انتہائی تقسیم ہے۔ عام طور پر لوگ ان دونوں قسموں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ البتہ کسی ایک ٹائپ کی خصوصیت ان میں نمایاں ہو سکتی ہے۔

ایک اور بڑا یونانی مفکر تھیوفریٹس (Theophratus) نے جو افلاطون کا شاگرد تھا، اس بات کی سب سے پہلے کوشش کی تھی کہ انسان کو کیرکٹر ٹائپ میں بانٹ دے۔ چونکہ کیرکٹر پیدائشی چیز نہیں ہے اور شخصیت پر ماحول کے اثر سے تیار ہوتا ہے اس لئے کیرکٹر کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم قابلِ بھروسہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ شخصیت ایک کچا مال ہے جس پر ماحول کے اثر سے کیرکٹر تیار ہوتا ہے مگر اس جنس میں شخصیت کی بنیادی خصوصیات جوں کی توں باقی رہتی ہیں۔ کیونکہ شخصیت انسان کی بنیادی ساخت کا حصہ ہوتی ہے اور تعلیم و خارجی اثرات زیادہ سے زیادہ اسکے تاثر میں اضافہ پیدا کر سکتے ہیں۔

خوش قسمتی سے اسی صدی کے تیسرے دہے میں ایک مایہ ناز جرمن ماہر نفسیات ڈاکٹر ای کرشمر (Dr. E. Kretchmer) نے جسم اور شخصیت کے قریبی تعلق پر کچھ مفید کام کیا ہے۔ اس نے بھی "ہپوکریٹس" کی بنیادی تقسیم کو قبول کر کے جسمانی اقسام کی مزید ذیلی تقسیم کی تفصیل اور حسب ذیل چارٹ پیش کیا ہے :-

	پیشہ	پکنک (Pyknic) گول چہرہ والا فرد	لیپٹوسم (Leptosome) لمبوترے چہرہ والا فرد
		حقیقت پسند	سوز و گداز کا دلدادہ ۔ تنہائی پسند
(۱)	شاعر	مزاح نگار	رومانی ، ہیئت پرست
(۲)	تجربہ کی دنیا والے	مشاہدہ کرنے والا ۔ تذکرہ نویس تجربہ کا دلدادہ	سخت قسم کا منطقی ، نظم و ضبط پسند کرنے والا ، مابعد الطبیعات سے دلچسپی رکھنے والا
(۳)	لیڈر	سرشت اگیں کاموں کی تنظیم سے دلچسپی رکھنے والا (امپورٹمس وغیرہ) ، صلح کرانے والا	پکا تصوریت پسند ، مطلق العنان ، جنونی بے رحم تخمینہ باز

ڈاکٹر کرشمر نے مزید یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ "پکنک" اور "لیپٹوسم" کے میل سے انسانی جسموں کی حسب ذیل اقسام بنتی ہیں۔

(۱) "پکنک" یعنی گول چہرہ اور جسم والا فرد۔ (۲) "لیپٹوسم" یعنی لمبوترے چہرہ اور جسم والا فرد۔ (۳) Athletic یعنی بٹے ہوئے جسم والا۔ جس کا چہرہ اور جسم تکونی یا بیضوی قسم کا ہوتا ہے۔

(۴) Dysplastic ۔ اس قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جن کے جسم کی ساخت بے ہنگم سی ہوتی ہے۔ ایسے مردوں کے جسم زنانہ جسم سے مشابہت رکھتے ہوئے ہوتے ہیں۔ (بھرے بھرے کولہے اور ران) اور عورتیں مردانہ جسم رکھنے والی ہوتی ہیں۔

اس پورے تجزیاتی مواد میں میں نے خود جو اضافہ کیا ہے اس سے حسب ذیل نتیجے نکلتے ہیں:۔

(۱) بنیادی طور پر سارے جسمانی ٹائپ کے انسان اپنے ہم قبیل ٹائپ کے انسانوں سے ہی دلچسپی اور کشش رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ اس مخصوص ہیئت میں ترقی پذیر انسانی کیت (کامیاب زندگی کے لئے ترقی پذیر خصوصیات) سما سکے۔

(۲) لیکن اگر کسی مخصوص قبیل کے انسان میں ترقی پذیری ختم ہو گئی ہو، یعنی اگر کسی فرد میں صرف ایک انتہائی خصوصیت پیدا ہو گئی ہو اور اگر وہ "پکنک" ہو تو اس میں گہرائی اور دور اندیشی نام کو نہ ہوگی اور سطحیت آجائے گی اور اگر وہ "لیپٹوسم" ہے تو وہ بہت زیادہ متوہلی، بے عمل اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والا فرد بنے گا۔ ظاہر ہے کہ انسانی نسل کی بقا ایسے نقطہ انجماد کو برداشت نہیں کر سکتی اس لئے وہ اپنی مخالف سمت کی ٹائپ کی خصوصیات حاصل کرنا چاہے گا۔ اس لئے وہ مخالف سمت کی ٹائپ کے جسم میں کشش محسوس کرے گا کیونکہ اس کی مستقبل کی نسل کے لئے مخالف ٹائپ کی خصوصیات درکار ہیں۔

(۳) چونکہ مختلف ٹائپ کے وجود کی وجہ سے مختلف حسن کے معیار متعین ہوتے ہیں اور ہر ٹائپ اپنی ہی قسم کے لئے کشش رکھتا ہے اس لئے تغیر پذیر ٹائپ میں اپنے خاندان سے روگردانی کرتے وقت اس کی ہیئت میں ایسی ظاہری تبدیلی آجاتی ہے کہ وہ اس کی پسندیدہ ٹائپ کے لئے قابل قبول ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی لمبوترے چہرہ کے فرد میں اپنے خاندان میں ترقی پذیری نہ نظر آئے تو بنیادی ساخت میں وہ لمبوترا ہونے کے باوجود گوشت پوست کے اضافے سے خود کو ایسا تبدیل کر لیتا ہے کہ وہ بالکل گول ہوں معلوم ہوتا ہے اور "پکنک" فرد سے شادی بیاہ کرنے یا نفسیاتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں کشش پیدا کرے گا۔

(۴) جمالیاتی حس افراد کی شخصیت کی تعمیر اور نسل انسانی کی بقا کے لئے ضروری خصوصیات حاصل کرنے میں اتصال کے ذریعے کام کرتی ہے۔ حسن چونکہ انسان کو ہیئت میں نظر آتا ہے اور ہیئت چونکہ ایک مخصوص کیت کی حامل ہوتی ہے اس لئے حسن ایک مخصوص انسانی شخصیت اور کیت کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

(۵) مختلف ٹائپ کی ان کی اپنی خصوصیات کی تصدیق کے لئے ہم آہنگی کے اصول کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی مخصوص ٹائپ اور اس کی مخصوص خصوصیت میں ہم آہنگی نہ ہو تو ایسا ٹائپ اپنے

ماضی سے فرار اختیار کرتا ہے اور مخالف سمت کی جانب بڑھتا ہے چنانچہ اگر کسی لمبوترے چہرے کے فرد میں گول چہرے والے ٹائپ کی خصوصیات ملیں تو ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ "لیپٹوسم" تغیر پذیر ہے اور "پکنک" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے فرد کو گول چہرے والے لوگ اور گول ساخت کی چیزیں ہی پسند آتی ہیں۔

یہ سب جمالیات کا ایک اور انقلابی اور مقصدی پہلو جس کی طرف انکشاف کی علمی کوشش کم کی گئی ہے۔

اس تحقیق سے ہیگل کی تصوری جمالیات کی خامی اور بھی واضح ہوجاتی ہے جس کی نہ تو بنیاد بتا سکتی ہے اور نہ اس کا مقصد۔

ان تحقیقات سے اب یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان اور فطرت کے ظاہری ہیئت کا تعلق ان کی کمیت سے بہت گہرا ہے اور یہ تعلق ایک باقاعدہ اٹل قانون کے مطابق ہے اور اس "..." سے جمالیاتی ذوق کسی ذہن کی بے تکی اختراع نہیں ہے بلکہ چلتی اور ابھرتی ہوئی ایک نامیاتی زندگی کی ایک خصوصیت ہے۔ جمالیاتی ذوق نہ صرف زندگی سے وابستگی کا ایک ذریعہ ہے بلکہ انسان اور فطرت کی ارتقائی کمیتی تبدیلی کی طرف ایک اشارہ ہے۔

جہاں ہم انسان اور فطرت کی حقیقی کشمکش کا داخلی پتہ نہیں چلا سکتے وہیں ہیئت اور اس کی دل کشی سے ان حقائق کے سامنے اندرونی راز معلوم کرسکتے ہیں۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کیوں بہت سے اچھے اور سمجھدار لوگ، دوسرے اچھے اور سمجھدار لوگوں کو پسند نہیں کرتے کیوں دو اچھے شریف میاں بیوی جمالیاتی اور نفسیاتی ہم آہنگی کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں اور تلخ زندگی گزارتے ہیں۔ انسان اعلیٰ سے اعلیٰ بننے کے مقصد کے لئے جمالیاتی روپ کا نہ صرف انسانوں کی حد تک ہی شکار ہوتا ہے بلکہ فطرت کی ہر چیز کو وہ اسی اصول سے ناپتا ہے چنانچہ گول چہرے کے مرد نہ صرف گول چہرے کی عورتوں کو پسند کرتے ہیں بلکہ گول نوک کے جوتے، گول وضع کے فرنیچر، گول بٹن اور گول ہیٹ وغیرہ پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح لمبوترے چہرے کے لوگ لمبوتری ہیئت کی اشیاء کو پسند کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مخصوص لوگ مخصوص رنگ اور مخصوص خوشبوئیات بھی پسند کرتے ہیں۔

انسانی ہیئت کی جمالیاتی دلکشی سے ہم نہ صرف انسان کے پیشے رنگ و بو اور رشتے کے تعین میں مدد لے سکتے ہیں بلکہ شخصیت شناسی میں بھی کام لے سکتے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی مخصوص ہیئت مخصوص کمیت کی آئینہ دار ہوتی ہے تو ایک مخصوص کمیت اپنی ہم رنگ کمیت کی خصوصیت میں بھی یکسانی بتا سکتی ہے۔ چنانچہ چہرہ شناس لوگ مخصوص چہروں کی مشابہت سے مخصوص خصوصیات کی مشابہت بھی پڑھ لیتے ہیں۔ کیونکہ جہاں چہرے مشابہ ہوتے ہیں وہیں ان کی خصوصیات بھی مشابہ ہوتی ہیں۔

شادی بیاہ یا شخصی دوستی کے لئے افراد کے انتخاب میں تو انسانی ہیئت کا جمالیاتی عنصر اس درجہ دائمی ہے کہ رنگ، نسل، پیشہ اور خاندان، مسلک اور قوم کی حدیں بے معنی ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اگر دو افراد ایک مشترک ٹائپ کے ہوں جس کی پہچان کے لئے انسانی جمالیاتی ہیئت رہنمائی کرسکتی ہے اور جہاں اس اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے انسانوں کے بیچ کا ظاہری اتحاد صرف سماجی اتحاد ہی ہوکر رہ جاتا ہے۔ دو دلوں کا اتحاد نہیں ہوتا۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علیگڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا